اُمید بیچتا ہوں

1857ء کی جنگ آزادی کے فوراً بعد تعمیر ہونے والی یہ دیوہیکل ریلوے سٹیشن کی عمارت آج تک لاہور کی فصیلوں کے باہر کھڑی ہے۔ لاہور شہر سبز کائی کی مانند اس کے چاروں طرف پھیلا ہے۔ آوازوں کا طوفان برپا ہے، سرمئی دھوئیں کی تہیں ہیں اور آوارہ، کبھی نہ فنا ہونے والے، پلاسٹک کے تھیلے ہوا کی موجوں کے ساتھ محوِ رقص ہیں۔

اس قلعہ نما عمارت کی تعمیر کا مقصد تو آزادی کی مزید تحریکیں کچلنا تھا۔ مگر جیسا کہ خدا کا نظام ہے، کچلنے والے تو نہ رہے لیکن کچلے جانے والے پیچھے چھوڑ گئے۔ اس عمارت نے بہت تحریکیں دیکھیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے توپوں کی گھن گرج تک برداشت کی۔ انگریزی کے حکم بھی سنے اور اردو کی سسکیاں بھی۔ فارسی کے وداعیہ نوحے بھی جھیلے اور ہندی کی سرگوشیاں بھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ہندوستان کے طُول وعرض سے متوالے موج در موج ایک نئے وطن کا خواب دل میں سجائے آئے اور صِلے میں قرارداد پاکستان کی سوغات لے کر گئے۔ اور پھر انہی در و دیوار نے خون میں

لت پت بوگیوں کو اپنے سینے پر آ کر رکتے دیکھا۔ یہی عمارت تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ہجرت کا محور بھی ٹھہری۔ اس خاموش تماشائی نے پاکستان بنتے، ہنستے مسکراتے، پھلتے پھولتے اور پھر زخمی ہوتے، چلاتے اور آخر ٹوٹتے بھی دیکھا۔ ان خاموش دیواروں میں صدیوں کی تاریخ پنہاں ہے۔ آج بھی اس کی پہیلی جیسی بل کھاتی رگوں پر اژدھے پھنکارتے ہوئے آتے ہیں اور چنگھاڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کئی امیدیں، کئی خواب ایک لمحے کو اس کی گود میں پناہ لیتے ہیں اور پھر چار و ناچار وقت کے گرداب میں کھو جاتے ہیں۔ یہ سنگلاخ دیواریں آنے والوں کے قہقہے اور جانے والوں کی سسکیاں سنتی ضرور ہیں مگر خاموش رہتی ہیں۔ ان کا کام نہ تو آنے والوں کو مایوس کرنا ہے اور نہ ہی جانے والوں کو روکنا۔ یہ تو گردش وقت کا ایک مہرہ ہے، ایک لمحہ ہے جو کسی کی ابتدا اور کسی کی انتہا بنتا ہے۔

میرا ایک دوست کراچی سے آنے والا تھا۔ اس کو لینے لاہور کے ریلوے سٹیشن پہنچا۔ مجھے اس سے ملنے کی جلدی تھی سو ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گیا۔ ہاں البتہ ریل گاڑی کو ایسی کوئی جلدی نہ تھی۔ اسی لیے اس کی آمد میں دو گھنٹے کی تاخیر تھی۔ لوگوں کے بے ہنگم ہجوم سے بچتا پلیٹ فارم پر پہنچا۔ ایک کونہ کچھ خالی نظر آیا تو اس کی طرف ہولیا۔ چائے والے سے چائے لی اور محوِ تماشا ہوا۔

ہم اپنے حواسِ خمسہ کے معاملے میں بھی خود غرض واقع ہوئے ہیں۔ ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہی سنتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں۔ آنکھ کا دریچہ کھلا ہو

تو کرنیں بلا امتیاز نقش بناتی ہیں۔ان منتشر نقوش میں سے ہم وہی دیکھتے ہیں جس پر ہماری نگاہ مرتکز ہو۔مگر یہ نقوش تو بلا امتیاز بنتے ہیں۔قانون قدرت ہے، روشنی کی ہر کرن اپنے ساتھ ایک بصری پیغام لے کر آتی ہے اور آنکھ کے پردے پر ثبت کر دیتی ہے۔ ہمارا ذہن یہ تمام متاع سمیٹ لیتا ہے اور محفوظ کر لیتا ہے۔ پھر انہی مخفی نقوش کو ترتیب دے کر کبھی خواب بنتا ہے، کبھی سراب بکھیرتا ہے تو کبھی مستقبل تراشتا ہے۔ اسی طرح ہر لمحے لامحدود آوازیں بھی ہماری سماعت کی چادر پر دستک دیتی ہیں اور محفوظ ہو جاتی ہیں۔اَب اس پونجی کو لاشعور کا گرداب کہہ لیجیے یا مشاہدے کا سمندر، یہی وہ بخیا ہے جو ہماری ذات بُنتا ہے اور ہمارے لیے زندگی کی راہیں متعین کرتا ہے۔ ہم سب ان سنی، ان کہی کہانیاں ہیں جن کے محض چند اوراق ہی لوگوں پر عیاں ہوتے ہیں۔ بہت سی کہانیاں تو خاموشی سے جانے والوں کے ساتھ ہی چلی جاتی ہیں۔لاہور کا یہ ریلوے سٹیشن انہی ان کہی، ان سنی کہانیوں کی آماجگاہ ہے۔ معاملہ نقطۂ نظر کا ہے۔اگر ریل کے ڈبے میں اپنی نشست پر بیٹھ کر باہر دیکھو تو لگتا ہے جیسے پلیٹ فارم پر کھڑا ہر شخص کسی اضطراب میں مبتلا ہے۔کسی کو گاڑی چھوٹ جانے کا ڈر تو کسی کو اپنے پیارے۔کوئی منزل کے انجانے خوف میں مبتلا تو کسی کی آنکھوں میں نئی منزلوں کی تلاش کی بے چینی۔ یہاں تک کہ سالوں سے آواز لگاتے چھابے والے، چائے والے اور دوسروں کے بوجھ میں برکت تلاشتے قلی، سب ہی اضطراب میں نظر آتے ہیں۔ایسے میں اگر کوئی مسافر اپنے پیاروں کو گاڑی میں بٹھا کر نیچے اترے تو کمال کا منظر پیش کرتا ہے۔خود بے چین ہے اور ان کو ہاتھ ہلا ہلا کر تسلیاں دیتا ہے۔ یہ کچھ کھو

جانے کا خوف ہماری ذات سے ایسا نتھی ہوا ہے کہ قبر تک نہیں چھوڑتا۔ نشست پر آرام سے براجمان اس مسافر کے لیے باہر شور ہے اور اندر سکون۔ اِضطراب سفر کا نہیں منزل کا ہے۔ اس بے ہنگم دنیا میں کسی بات کا یقین ہونا بھی ایک نعمت ہے۔ ٹکٹ لے لی، نشست مل گئی، اب تو بس منزل باقی ہے۔ سفر تو کٹ ہی جائے گا۔ اپنے ساتھ بیٹھے اجنبی ہمسفر زیادہ قریب لگتے ہیں اور باہر رہ جانے والے کوسوں دور۔

لیکن باہر سے تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ لوہے کے زندان میں اپنے حصے کی ذرہ سی جگہ پر سہما سمٹا وہ مسافر جو گھر، گھر والے اور گھر ہستی چھوڑ کر چلا ہے، ابھی کچھ ہی لمحوں میں پردیسی یا غریب الوطن کہلائے گا۔ بنیاد ہی تو سب کچھ ہے۔ اپنی زمین، اپنا آسمان، اپنا گھر۔ یہی تو ہم چاہتے ہیں۔ پھر، یہ شخص کیوں ایک غیر منحصر منزل کی تلاش میں سرگرداں ہے؟ جب قدم جمانے کو زمین ہے تو آسمان کی وسعتوں یا سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو کیوں ٹٹولنا۔ ترس آتا ہے اُس لاچار کو دیکھ کر۔ ہم پلیٹ فارم پر کھڑے رہ جانے والے، اُن کی آنکھوں میں اپنی جھلملاتی تصویریں تلاش کرتے ہیں۔ ہمیں ہر جگہ اپنا ہی تو عکس نظر آتا ہے۔ میری سوچ، میرے خیالات، میرے تجربات اور میرا نقطۂ نظر ہی تو قابل تقلید ہے۔ ہم سب نے اپنے ذہنوں میں ہر قول و فعل کا ایک سانچہ بنا رکھا ہے اور سب کو اسی سانچے کی بنیاد پر پرکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ دوسرا ہمارے سانچے کو ہی معتبر جانے۔ تبدیلی ایک مشکل فیصلہ ہے۔ انہونی کا خوف، انجانی جگہ کا وہم اور پرایوں سے مڈبھیڑ کا اضطراب

تبدیلی کی سوچ کے جزوِلازم ہیں۔ جہاں تبدیلی کے انعامات ہیں وہاں اس کی قیمت بھی ہے۔ بہت کم لوگ یہ قیمت دینے کو تیار ہوتے ہیں کیونکہ کبھی تو ان کی پونجی بمعہ سود کے لوٹ آتی ہے اور کبھی اصل زر بھی کھو جاتا ہے۔

صاحب جی قسمت کا حال جانیں گے اور وہ بھی صرف دس روپے میں۔ ایک دلچسپ سی آواز نے میرے تماشے کا پردہ گرا دیا۔ دائیں ہاتھ مڑ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر شخص ایک مٹی سے اٹے گتے کے ٹکڑے پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے دھول کی رنگت کے کپڑے پر کچھ کارڈ الٹے پڑے تھے۔ اُن پر موجود مصوری کسی زمانے میں رنگین رہی ہوگی۔ اَب صرف یادِ ماضی کی مانند دھندلی تھی۔ اس کے داھنے ہاتھ لوہے کا پنجرہ دھرا تھا جس میں ایک چھوٹا سا سبز طوطا اپنی مٹکتی آنکھوں سے اپنے مالک کا ہی سوال دہرا رہا تھا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا، ایک پنسل، ایک گھڑا جسے ایک بوسیدہ سی بوری لپیٹ کر ڈھنڈار رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا اور ایک لکڑی کا کالا بورڈ جس پر سفید چاک سے صرف دو سطور لکھی تھیں، ''اپنی قسمت کی فال نکلوایئے۔ صرف 10 روپے میں۔''

رہنے دو یار میں تو ریل گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے بلاوجہ ہی اکتا کر جواب دیا۔ پہلے ہی دو گھنٹے کی تاخیر ہے۔ تم بھی فارغ ہی نظر آتے ہو۔ کام کیسا چل رہا ہے؟ لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہو؟ حیرت ہوتی ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی لوگ تم جیسوں کے ہاتھوں دھوکا کھا جاتے ہیں۔

ہاہا۔ وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ بھرے بیٹھے ہو؟ صاحب آپ جیسے لوگ خیرات

تو دیتے نہیں لیکچر اچھا دیتے ہیں۔ خیر بڑے آدمی ہیں آپ، ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ ہم ضرورت مند، ہمارا گاہک ضرورت مند، بھری جیب اور بھرے پیٹ کو قسمت سے کیا لینا دینا۔ آپ جیسوں کو خدا بس ڈوبتے ہوئے ہی یاد آتا ہے۔ اس کے طنز نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر لیا۔ بڑا فلسفہ جھاڑ رہے ہو۔ کون بڑا آدمی؟ خدا کی ذات کا شکر ہے جو رزاق اور پردہ رکھنے والا ہے۔ ہاں البتہ اس بات پر کامل ایمان ہے کہ مستقبل کا خدا کی ذات کے علاوہ کسی کو علم نہیں۔ جو لوحِ محفوظ کا مصنف ہے، اسی کے ہاتھ میں سب کی باگ دوڑ ہے۔

میں بھی ایمان والا ہوں صاحب۔ آپ کو کس نے یہ خبر دی کہ میں قسمت کا حال جانتا ہوں۔ آپ ہی نے کہا تھا ناں کہ خدا ہی ہمارے روز و شب کا خالق ہے۔ تو جناب میرے ذمے یہ کام لگا ہے۔ من و سلویٰ بھی ملے تو بھی تگ و دو تو لازم ہے۔ اپنی روزی کے لیے کوشش کرنا سنت ہے۔ زندگی میں اگر منزل کی جستجو نہ ہو تو انسان اور جانور میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اسی منزل کی خواہش ہی تو ہمیں صنم سے انسان بناتی ہے۔ بس یہی میرا کام ہے۔ میں منزل کی تگ و دو کرنے والوں کو تنکے کا سہارا دیتا ہوں۔ باقی رب کی مرضی۔

حالت فقیرانہ اور باتیں دانشمندانہ۔ کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ جاؤ جا کر کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔ معاشرے کا کارآمد حصہ بنو۔ کہانیاں لکھو، علم پھیلاؤ۔ مجھے اپنے لہجے میں اس کی بات کی سچائی اور اپنے غرور کا طنز تو محسوس ہوا جسے میں نے

نظر انداز کر دیا۔

اور کیا کر رہا ہوں صاحب؟ کہانیاں ہی تو لکھ رہا ہوں۔ یہ فالیں کہانیاں ہی تو ہیں اور لوگ نقاد۔ کچھ یقین کر لیتے ہیں اور کچھ ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ کہانی پسند آ جائے تو اجرت دے جاتے ہیں، ورنہ گالی۔ مگر ذمہ ایک کام لگا ہے سو کر رہا ہوں۔ اپنے حصے کا رزق مل جاتا ہے۔ گھر کا چولہا جل رہا ہے، کام چل رہا ہے۔

تم لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو، ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا رہے ہو، ان کے جذبات سے کھیل رہے ہو، ان کی کمزوریوں کا کاروبار کر رہے ہو، حرام کماتے ہو، حرام کھاتے ہو۔ میرے لہجے کی کاٹ بے رحم تھی۔

چلیں دیکھتے ہیں۔ اس نے سکون سے جواب دیا۔ آپ کے پاس بھی وقت ہے۔ میرے پاس بیٹھیے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی خدا کا بندہ آ جائے۔ خود ہی ملاحظہ کر لیجیے گا۔ ورنہ میرے تاثر کا سانچہ تو آپ نے تراش ہی رکھا ہے۔ ہاں، ایک گزارش ہے، اگر کوئی آ ہی جائے تو اپنے لفظوں کے موتی اس کے جانے تک سنبھال کر رکھیے گا۔ اس نے ایک مٹی سے اٹا گتے کا ٹکڑا میری طرف بڑھایا جسے میں نے جھاڑا اور اس کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے میاں مٹھو کے گُن گنوانے لگا۔

خدا جانے انسان کی جانور کے ساتھ اتنی افہام و تفہیم کیسے ہو جاتی ہے۔ نہ زبان کی مماثلت، نہ ثقافت کا رشتہ، نہ مذہب کا بندھن اور نہ ہی خون کی تقلید۔ لیکن یہ

دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے۔ مجھے تو فال کے پتے محض دکھاوا ہی لگے۔ اصل کمال تو طوطے کا تھا۔ بحیثیت انسان، ہم انسانوں پر ذرا کم ہی یقین رکھتے ہیں، شک رہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ہم اپنے آپ کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ جب ایک بے ضرر پرندہ فال کا پتا اٹھاتا ہے، تو اس کی معصومیت پر کسی کو شک نہیں گزرتا۔ ہمارا اس سے لین دین کا کوئی تعلق نہیں۔ اسے ہم سے، ہمارے ماضی، ہماری خامیوں اور خوبیوں، یہاں تک کہ ہمارے مستقبل سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہمارے لیے جذبات کی رتی تک نہیں۔ اسے ہمارے نمود ونمائش کی کوئی پرواہ نہیں۔ شاید اسی لیے ہم اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ اسے معصوم کے لقب سے اس لیے نوازتے ہیں کیونکہ وہ ہماری اصل نہیں جانتا۔

انسان ہمیشہ اس سے ڈرتا ہے جو اس کے باطن سے واقف ہو۔

بھائی کیا قسمت کا حال بتاتے ہو؟ ایک تھکی ماندی آواز نے ہم دونوں کو چوکنا کر دیا۔

نہیں بھائی، میں کون ہوتا ہوں قسمت کا حال بتانے والا۔ ہاں البتہ خدا کے حکم سے یہ معصوم طوطا فال نکالتا ہے۔ میں تو محض پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔ فال والا گویا ہوا۔ اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

کتنے پیسے لو گے؟ مسافر نے استفسار کیا۔ قیمت تو لکھی تھی بورڈ پر شاید نہ پڑھ

سکتا ہو۔ دس روپے۔ فال والے نے جواب دیا۔ بہت زیادہ ہیں۔ ایک نحیف سا جواب آیا۔ کیا کریں بھائی۔ پیٹ کا دوزخ ساتھ لگا ہے اور آپ ہی وسیلہ ہیں۔ پھر اس میاں مٹھو کے نخرے بھی تو اٹھانے ہوتے ہیں۔ اس بار اس کے لہجے میں ہلکی سی کھنک سنائی دی۔ آدمی چالاک ہے۔ میں نے سوچا۔ مکڑی کی طرح جالا بن رہا ہے۔

اچھا چلو، یہ لو دس روپے۔ بتاؤ کیا لکھا ہے میری قسمت میں۔ اس مسافر کے الفاظ ہارے ہوئے جواری کے پتوں کی مانند مٹیالے کپڑے پر بکھر گئے۔

فال والے نے فوراً دس روپے اپنی جیب میں ڈالے اور بولا، ''فال نکالنے سے پہلے ایک بات اچھی طرح سے سمجھ لو۔ مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری فال میں کیا لکھا ہے۔ جو لکھا ہوگا وہی بول دوں گا۔ جھوٹ نہیں بولوں گا، چاہے تمہیں برا لگے۔''

ٹھیک ہے؟ مسافر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پانی پیو گے؟ فال والے نے ایکدم سوال داغ دیا۔ میں اور مسافر دونوں ہی اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ پانی پیو گے؟ اس نے مسافر سے پھر پوچھا۔ ہاں، مہربانی۔ اس کی ہاں کی گرم جوشی اس کے پیاسا ہونے کی تصدیق تھی۔ فال والے نے گھڑے سے ایک گلاس پانی کا بھرا اور اسے دے دیا، جسے وہ غٹا غٹ پی گیا۔

کیا نام ہے تمہارا؟ افتخار۔ کہاں سے آئے ہو؟ جھنگ سے۔ جھنگ شہر سے؟

نہیں۔اس کے نزدیک ایک قصبہ ہے، وہاں سے۔لاہور میں کوئی ہے؟نہیں، اکیلا ہی آیا ہوں۔ماں، باپ؟ہاں ہیں،ضعیف ہیں۔شادی ہوگئی؟نہیں،ابھی نہیں۔

افتخار جو اَب تک سر جھکائے بیٹھا تھا، ایک دم چوکنا ہوگیا۔اس نے سر اٹھایا اور فال والے کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔تم یہ سب سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟اس کا لہجہ سرد تھا۔تم لاہور پہلی بار آئے ہو۔پھر یہ نہ کہو کہ لاہوریوں نے پانی بھی نہیں پوچھا۔فال والے کا لہجہ نرم اور چہرے پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔افتخار پھر زمین کو گھورنے لگا۔

چل بھئی میاں مٹھو، اپنے افتخار بھائی کی قسمت کا حال بتا۔نکال اس کے حصے کی فال۔اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور ایک سوکھی ٹہنی آگے بڑھائی۔میاں مٹھو بڑی شان سے اس ٹہنی پر سوار ہوگیا اور فال والے نے اسے فال کے پتوں کے قریب کپڑے پر اتار دیا۔اَب میاں مٹھو نے ہلکے ہلکے سے ٹہلنا شروع کیا۔وہ ہر پتے کے پاس رکتا، دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ایک چکر، دوسرا چکر۔افتخار کی آنکھوں میں بے چینی اور اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔تیسرا چکر اور پھر وہ ساتویں نمبر پر پڑے فال کے پتے کے پاس رک گیا۔اس نے اپنی چونچ سے وہ پتا اٹھایا جسے فال والے نے بڑی تندھی سے اچک لیا۔اس نے پتے کو ہاتھ میں پکڑ کر اسے غور سے پڑھنا شروع کیا، جیسے اس پر موجود آڑھی ترچھی لکیروں اور ہندسوں کو معنی پہنا رہا ہو۔پھر اس نے پنسل اٹھائی اور کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔آخر میں اس نے کارڈ اور کاغذ دونوں ہی اپنی

جگہوں پر واپس رکھے اور کھنکار کر سیدھا بیٹھ گیا۔اس کی نم آنکھوں میں ایک کائنات تھی۔جیسے صدیوں کا سفر کر کے آیا ہو۔

کیا لکھا ہے؟ افتخار نے ہلکے سے پوچھا جیسے خود بھی جواب سے خوفزدہ ہو۔مگر فال والا خاموش رہا۔

کیا لکھا ہے؟ اس بار افتخار کے لہجے میں ترشی کا تڑکا تھا۔ پہلے تین مہینے بہت مشکل ہیں۔ فال والا ایسے بولا جیسے کوئی افریت ہو۔رزق میں تنگی ہے۔شاید کچھ لوگ بھی دھوکا دیں۔ بہت کڑا وقت ہے۔لیکن، یہ ایک امتحان ہے۔ان تین مہینوں کے بعد خیر ہے۔خدا کی رضا سے سب ٹھیک ہو جائے گا، اگر تم ہمت کرو، دعا کرو اور کوشش کرو۔تین مہینے بوجھ کے ہیں۔اٹھا سکتے ہو تو وہ رہا لاہور۔نہیں اٹھا سکتے تو اگلی گاڑی سے لوٹ جاؤ۔

افتخار جیسے بت سا بن گیا ہو۔اس کی ایک دوسرے سے نبرد آزما انگلیاں، اس کی اندر کی کشمکش کی آئینہ دار تھیں۔اس کا سر ابھی بھی جھکا تھا مگر بدن میں تناؤ تھا۔وہ ہلکا ہلکا ہل بھی رہا تھا جیسے وجد کے عالم میں ہو۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ اٹھا۔اس نے فال والے کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے ریلوے سٹیشن کے برآمدے سے ہوتا ہوا، لاہور کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

یہ تم نے کیا کِیا؟ میں نے الجھ کر پوچھا۔ایک شخص جو پہلے ہی مجبور تھا۔تنگ

دستی کا شکار تھا۔تم نے اس سے بھی دس روپے چھین لیے۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے؟ یہ خودغرضی ہے،فریب ہے، جرم.....

بول لیا؟ اس کی آواز جیسے سرد خانے سے آئی ہو۔اَب سنو۔ یہ شخص گھر چھوڑ کر آیا ہے۔ ماں چھوڑ کر آیا ہے۔سر کا سایہ اور بھوک کی دوا چھوڑ کر آیا ہے۔ کچھ تو مجبوری رہی ہوگی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس مجبوری میں بے شرمی سے جیئے جاتے ہیں۔مگر یہ نہیں۔ یہ کچھ کرنا چاہتا ہے۔ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ منزل کی خواہش ہے مگر اُس کا تعین نہیں۔جسم تیار ہے لیکن ذہن خلفشار کا شکار ہے۔ابھی تو یہ اپنے فیصلے پر پشیماں ہوگا، راتوں کو چھپ کر روئے گا، کسی جاننے والے کی بھینٹ چڑھے گا،شاید کسی سڑک کے کنارے پر سوتا بھی ملے۔نوکری کے لیے التجائیں کرے گا۔ابھی تو اسے سچ مچ کے افلاس اور مجبوری کا مطلب بھی معلوم نہیں۔اس سب کو تیاگنے کے لیے وقت چاہیے، سہارا چاہیے، رونے کو کاندھا اور بہلانے کو آسرا چاہیے۔نہیں ہے اس کے پاس۔آپ کو بھی معلوم ہے کہ نہیں ہے۔ جنابِ عالیٰ اِس گندے کپڑے سے یہ تین مہینے کا راشن لے کر اٹھا ہے۔اس نے مان لیا ہے کہ تین ماہ تو اذیت کے ہیں ہی لیکن پھر برکت ہے۔اور یہ فیصلہ اُس نے خود کیا ہے، میں نے تو فقط انتخاب کی سہولت دی ہے۔آپ کہتے ہیں کہ میں نے ظلم کیا، جرم کیا۔ میں نے تو دس روپے میں امید بیچ دی ہے۔اگر آپ میں ہمت ہے تو قیمت لگائیں۔